© rasailojaraid.com



زاھد منیر عامر

# شاہ جی! اپنے اسلوب نگارش کے آئینے میں

سید عطاءاللہ بخاری کو جو قدرت اللہ تعالیٰ نے زبان و بیان پر عطا فرمائی تھی اس بناء پر وہ نہ صرف اپنے دور کے خطباء میں بلکہ بعد میں آنے والے دور میں بھی خاتم الخطباء تھے اور اس لحاظ سے انہیں خطابت کا "ابوالوقت" بھی کہا جا سکتا ہے ان کی شخصیت کے ہمہ جہتی مطالعہ سے اس کے جو پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں ان کے مطابق وہ صرف ایک خطیب ہی نہ تھے بلکہ ایک عارف باللہ بھی تھے اور ایک اچھے نعت گو بھی تھے ان کی جو نعتیں ہمیں ملتی ہیں صرف انہی کے مطالعہ سے ان کے عشق رسول ﷺ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے شاعری کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں نثر پر بھی قدرت عطا کی تھی ان کے منظوم و منثور کلام کا جو حصہ ہمارے سامنے ہے اس سے جہاں ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے وہاں ان کے مطالعہ کی وسعت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

شاہ جی نے اصلاً نثر نگاری نہیں کی ان کے نثری ذخیرہ میں صرف دو ایک مضامین چند خطوط اور ایک مقدمہ شامل ہیں اس مختصر نثری سرمایہ میں جو مضامین نظر آتے ہیں ان کی بنا پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت کے اس پہلو کا بھی تجزیہ کیا جائے۔ مضمون کا مطلب انگریزی لفظ (EASSAY) کے مترادف ہے یا اسے کسی خاص موضوع پر مجموعۂ خیالات بھی کہا جا سکتا ہے مفہوم اور موضوع بھی مضمون کے مطلب کے ضمن میں آتے ہیں 'ایک اچھے مضمون کے خصائص میں جو چیزیں شامل ہیں۔ان میں موضوع کے عنوان (موضوع کی وضاحت) اور مختلف واقعات کو مختلف حصوں "پیراگرافس" میں لکھنا اور واقعات کا ارتباط قائم رکھنا شامل ہیں۔ علاوہ ازیں عبادت کی سلاست' روانی' ایجازو اختصار' (جسمیں اگر سادگی کا عنصر شامل ہو تو اور بھی اچھا ہے) فقرات کی چستی اور بندش اور قاری کو محو کردینے کی خصوصیات بھی ایک اچھے نثرپارہ کی خوبیوں میں شامل ہیں۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی نثر جہاں ان کے مزاج اور ماحول کی عکاسی کرتی ہے وہاں ایک ٹھوس قوت بیان کی بھی حامل ہے شاہ جی تصورات سے زیادہ عمل کو اہمیت دیتے تھے تحریر سے زیادہ تقریر پر زور دیتے اور سکون سے زیادہ متحرک زندگی کو پسند کرتے تھے۔ بقول خود ان کی نصف زندگی جیل میں اور نصف ریل میں گزری ان کے مزاج کو ایک ایسے پہاڑ سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جس کی بلندی پر کوئی شک نہ کر سکتا ہو' جس پختگی پر کسی کو نظر اٹھانے کی جرات نہ ہو سکے یا ایک ایسا طوفان کہا جا سکتا ہے جس میں بلا کی طاقت ہو اور وہ اپنی طاقت کو پورے طور پر بروئے کار بھی لائے۔



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



الغرض ان کے مزاج میں بجلی کی سی تیزی، پھول کی سی لطافت، آبشار کی سی روانی، سمندر سا جوش و خروش اور زندگی ایسی متاع بے بہا کی پوری رمق شامل تھی اور ان کی تحریر میں جن عوامل کی کارفرمائی نظر آتی ہے ان کا خمیر انہی اجزاء سے مل کر بنا ہے جن سے ان کی زندگانی عبارت ہے۔ لیکن اپنی زندگی میں انہیں حوادث سے سابقہ رہا اس کے اثرات بھی ان کی تحریر میں نمایاں ہیں علاوہ ازیں ان کی زندگی کا خاص وصف یعنی خطیبانہ لہجہ بھی ہے ان کی نثر میں واضح طور پر چھلکتا ہے۔ ایک اچھی تقریر کے اجزاء میں بیان کا ارتباط سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے اور شاہ جی کی تحریر میں یہ خاصیت پوری طرح جلوہ گر ہے مثلاً جیل خانہ کی زندگی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

" جیل خانہ زندگی کے سفر کا ایک ایسا موڑ ہے جہاں کبھی طلب کے خیال سے رکنا پڑتا ہے، کبھی فرض کی کشاکش لے آتی ہے اور کبھی جستجوئے منزل کا تقاضا پہنچا دیتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اب جیل خانہ کی آبرو پر بھی بوالہوس نے پیش دستی شروع کی ہوئی ہے اور

" جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں"

(" میرا عقیدہ" روزنامہ کوہستان لاہور مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۶۱ء)

اب ذرا ان تراکیب پر غور کیجئے ! کیا ادبی لحاظ سے ان میں کوئی سقم پایا جاتا ہے ؟ فرض کی کشاکش، جستجوئے منزل، طلب کا خیال، ایسی تراکیب ان کے خاص ادیبانہ مزاج کا پتہ دیتی ہیں ایک اسی اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا مطالعۂ زندگی کس قدر وسیع تھا کہ انہوں نے زندگی کے ایک موڑ یعنی جیل خانہ کی حقیقت کو کس قدر حقیقت افروز اور جامع پیرائے میں بیان کیا ہے اسی مضمون کی ایک اور عبارت میں شاہ جی نے اپنی زندگی کے تجربات و مشاہدات کو اپنے دو جلیل القدر عزائم (جذبات) میں بلا کی شدت اور حرارت پیدا کرنے کے باعث قرار دیا ہے اور وہ عزائم ہیں " قرآن کی محبت اور انگریز سے نفرت"

شاہ جی جب اپنی زندگی کے یادگار واقعات کو بیان کرنے لگتے ہیں تو ان کی تحریر میں ایک خاص سوز و گداز پیدا ہو جاتا ہے لیکن جب وہ اس کے حال پر نظر ڈالتے ہیں تو یکایک ان کی تحریر میں ایک گونہ آزردگی و افسردگی کا احساس عود کر آتا ہے وہ اپنی زندگی کی یادگار قید کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

" میانوالی جیل میں احباب کی ایک یادگار بزم، سب اہل ذوق، اہل نظر، اہل دل اور اہل علم جمع تھے۔ مولانا احمد سعید دہلوی حدیث پڑھایا کرتے عبدالمجید سالک دربار اکبری کا سبق دیتے مولوی لقا اللہ کی نپی تلی باتیں گفتگو میں رس پیدا کرتیں۔ صوفی اقبال پانی پتی کے اشغلے ! خدا کی پناہ ! عبداللہ چوڑی والے کی ٹکسالی گالیاں تبرک کی طرح تقسیم ہوتیں اور آصف علی کھلتے تو پھولوں کے تختے بچھ جاتے جی خوش کرنے کے لئے کبھی مشاعروں کا بھی اہتمام ہوتا شاعر طرحی و غیر طرحی کلام سناتے کبھی سالک صدر ہوتا کبھی آصف اور کبھی۔

قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



اس پیرگراف پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والا کس دلچسپی سے اپنے ساتھ بیتے ہوئے واقعات بیان کر رہا ہے کس خوبصورت انداز سے اپنے احباب کو یاد کرتا ہے اور کس طرح قاری کو ان ایام کی تصویر دکھا کر متاثر کرتا ہے۔

شاہ جی ایک وسیع مشاہدہ رکھنے والے انسان تھے یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ ان کا مطالعہ بھی بہت وسیع تھا ادب' اس کی مختلف شاخوں اور شاعری وغیرہ کے موضوعات پر ان کا علم خاصا وسیع تھا۔ ادبی تحاریک کے مختلف ادوار اور ان کے حالات سے کماحقہ آگاہ تھے۔ اس بات کا علم جہاں ان کے خطبات سے ہوتا ہے وہاں ان کی تحریر میں بھی اس کے متعلق اشارے ملتے ہیں نظم و نثر کے متعلق ان کے مطالعہ کی وسعت کا خفیف اندازہ اس تحریر سے ہوتا ہے جو نور احمد خاں فریدی کی کتاب "صدرالدین عارف" پر بطور تقریب لکھی گئی۔ اس میں لکھتے ہیں۔

میرے نزدیک مولانا کا وہی مقام ہے جو انیس کی نظم کا۔ وہ سہل ممتنع لکھتے ہیں اور انہیں روزمرہ پر پوری قدرت حاصل ہے وہ پینتیس سال سے اپنا خون جگر دماغی قوتیں اور ادبی صلاحیتیں علم و عرفان اور تاریخ و تصوف کی خدمات میں صرف کر رہے ہیں ان کا قلم آب حیات کے قطرات سے تشنگان علم و مذہب کی پیاس بجھانے میں مصروف ہے" (صدرالدین عارف ص نمبر۴ ناشر قصرالادب ملتان جلد اول)

اسی تحریر میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

"یوں تو شیخ العارف اور ان کی اولاد اسجاد کی سیرت کے ایک ایک حرف میں بصیرت و موعظت کے ہزار دو ہزار ساماں موجود ہیں لیکن پھر بھی ان میں کئی مقام ایسے آتے ہیں جہاں انسانی نگاہیں بے اختیار رک جاتی ہیں دل کی دنیا میں ایک تہلکہ سا مچ جاتا ہے اور خون جگر اشک ہائے ندامت کی صورت میں آنکھوں سے ٹپکنا شروع کر دیتا ہے۔" (حوالہ مذکور)

ان اقتباسات سے جہاں اولیاء اللہ سے ان کی عقیدت کا احساس اجاگر ہوتا ہے وہاں زبان پر ان کی قدرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ "دل کی دنیا" اگرچہ ایک پامال ترکیب ہے مگر شاہ جی نے جس خوبصورتی کے ساتھ اسے اپنی تحریر میں سمویا ہے اس نے اس کی پامالی کے احساس کو ختم کر دیا اور پھر دل کی دنیا میں تہلکہ مچ جانا کے بعد خون جگر کا اشک ہائے ندامت کی صورت میں برآمد ہونا ان کی تحریر کے محاسن کا پتہ دیتے ہیں اور یہ باتیں صرف وہی انسان لکھ سکتا ہے جو خود صاحب حال ہو اور صاحب دل ہو اور شاہ جی جیسا کہ گزشتہ سطور میں گزرا خود ایک عارف باللہ تھے۔

وسعت مطالعہ کے ساتھ شاہ جی نے کمال کا حافظہ بھی پایا تھا اور اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود بھی وہ مختلف اساتذہ کے دواوین زیر مطالعہ رکھتے تھے ایک مرتبہ خود شاہ جی نے فرمایا تھا کہ "دو کتابیں سفر و حضر میں ہمراہ رہتی ہیں ایک قرآن اور دوسری دیوان غالب لیکن قرآن پاک اوپر رکھتا ہوں اور دیوان



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



کمال حافظہ کی ایک مثال ملاحظہ ہو کہ میانوالی جیل میں ایک مرتبہ اختر علی خان نے ایک معرکہ کی غزل سنائی وہاں عبدالمجید سالک ' آصف علی اور لقااللہ جیسے لوگ موجود تھے کوئی اس غزل کی حقیقت تک نہ پہنچ سکا مگر شاہ جی نے اس کی اصل کو جانچ لیا اس واقعہ کو بیان کے بعد لکھتے ہیں۔ "میں نے اختر سے کہا میاں مقطع سے کہو وہ کسی قدر جھینپا میں نے کہا تو لو پھر مجھ سے سنو مقطع۔

جو مے کشی سے ہو فرصت تو دو گھڑی کو چلو

امیر مسجد جامع میں آج امام نہیں"

سب ششدر رہ گئے۔ ارے امیر مینائی کی غزل اڑالی سولات کی ایک بوچھاڑ ہونے لگی اختر علی خان مقطع کے ساتھ ہی بزم سے غائب ہوگئے۔" (مضمون متذکرہ)

(بحوالہ "وے صورتیں الٰہی" ڈاکٹر عبدالسلام خورشید مطبوعہ لاہور)

انکسار شاہ جی کی طبیعت کا ایک خاص وصف تھا جو انہیں اپنے دور کے بڑے بڑے لیڈروں جن میں سے اکثر غرور و تکبر کا شکار تھے سے ممتاز کرتا ہے۔ اسی انکسار کی جھلک ان کی تحریر میں بھی ملتی ہے جس سے ان کی شخصیت کے اس پہلو پر بھی روشنی پڑتی ہے اور ایسے مواقع پر ان کا اسلوب عقیدت مندانہ یا نیاز مندانہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً مولانا حسین احمد مدنی رحمتہ اللہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

" صدر صاحب تو اس وقت کلکتے پہنچے ہوئے ہیں ان چند سطروں کے پیش کرنے کا شرف مجھے حاصل ہو رہا ہے حضرت کی خدمت اقدس میں جو عریضہ ارسال کیا گیا ہے وہ محض اظہار مقصد کے لئے ہے اب حضرت والا اپنی مرضی کے مطابق جہاں مناسب خیال فرمائیں اور جس مقام کو موزوں سمجھیں اور جن حضرات کو دعوت دینا حضرت کی نظر برکت اثر میں ضروری ہو ارشاد فرمائیں ان شاء اللہ ارشاد عالی کی تکمیل ہوگی۔"

(بحوالہ "مکتوبات شیخ الاسلام" مرتب نجم الدین اصلاحی جلد دوم مطبوعہ ہندوستان)

یہ خط اگرچہ کسی وقتی مسئلہ کے متعلق ہے مگر شاہ جی کا انداز ملاحظہ ہو کہ وہ چھوٹتے ہیں لکھتے ہیں ان سطروں کے پیش کرنے کے شرف مجھے حاصل ہو رہا ہے۔" اس میں شک نہیں کہ شاہ جی مولانا مدنی کا بہت احترام کرتے تھے مگر سیاسی رائے میں ان میں اختلافات بھی رہے اور بعض اوقات یہ اختلافات شدت بھی اختیار کر گئے مگر شاہ جی نے احترام برقرار رکھا اس کی وجہ ان کی طبیعت کا وہی نمایاں وصف تھا جس کا اوپر ذکر ہوا۔

اسی نوعیت کی ایک اور تحریر ملاحظہ ہو جس میں اپنے ایک شعر کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا احمد علی لاہوری رحمتہ اللہ کو لکھتے ہیں۔



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



"میرے وہم میں بھی ذم کا یہ پہلو نہیں تھا' چونکہ آپ فرماتے ہیں شعر سے ذم کا پہلو نکلتا ہے۔ آپ کے ارشاد کے بعد میں اس شعر کی کوئی تاویل نہیں کرنا چاہتا اور استغفراللہ پڑھتا ہوں آپ ہی میرے حق میں دعا کریں اللہ تعالیٰ مجھے معاف کر دے۔"

(بحوالہ "حیات امیر شریعتؒ" از جانباز مرزا مطبوعہ لاہور)

اب شاہ جی کی عظمت کا اندازہ کیجئے کہ اتنا بڑا آدمی جس کے عقیدت مند بے شمار ہوں اور جو اپنی للکار سے فرنگی ایسے سامراج کو للکار چکا ہو۔ جس کی ساری زندگی اسلام اور وطن کی خدمت و آزادی کے لئے صرف ہوئی ہو' کسی غرور و نخوت کا اظہار نہیں کرتا۔ تاویل کی ضرورت نہیں تھی اگر وہ محض اپنے شعر کا پس منظر بیان کر دیتے تو بھی حقیقت کی وضاحت ہو سکتی تھی مگر وہ کسی تعبیرو تشریح کے چکر میں پڑے بغیر صاف الفاظ میں استغفراللہ پڑھتے ہیں اور دعا کے لئے التجا کرتے ہیں۔

شاہ جی کی صلاحیتوں اور خدمات کا ایک زمانہ معترف ہے لیکن اپنے شاگرد قاضی احسان احمد شجاع آبادی کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

" قاضی جی! میں تو جیسا نکما ہوں آپ جانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت صلاحیتیں عطا کی ہیں اور بہت لوگوں کو آپ سے فائدے پہنچتے رہتے ہیں۔"

(بحوالہ "قاضی احسان احمد شجاع آبادی" از نور الحق قریشی مطبوعہ ملتان)

درحقیقت انکسار ایک ایسا جوہر ہے جو کسی بھی انسان کو بڑا بنا سکتا ہے اور جب ایک بڑا انسان اسے اپناتا ہے تو اس کا مرتبہ اوج ثریا تک جا پہنچتا ہے اور شاہ جی میں انکسار کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

شاہ جی کی تحریر پر غور کرنے سے ان کی شخصیت کے نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں ان اجزا سے جہاں وہ مرکبات کی مترشح ہوتے ہیں جن سے مل کر شاہ جی کی شخصیت کی تعمیر ہوتی تھی وہاں ان کی تحریر کے حسن کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے احسن تحریر کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔

"دوست زندانی مصائب سنانے میں لذت محسوس کرتے ہیں اور میں عیب۔ یہ اپنا اپنا زاویۂ نظر ہے۔ میں ان مصیبتوں کو رسوا کرنے کا عادی نہیں' میرے لئے جیل خانہ صرف نقل مکانی ہے۔ میں اپنے گرد و پیش باغ و بہار فراہم کر لیتا ہوں اور قیدیوں گزر جاتی ہے جیسے صحرا سے بادل" (میرا عقیدہ)

شاہ جی کی تحریر میں جو بانکپن ہے اس کا اظہار ان کے ایک خط میں بھی ہوا ہے اس خط کا اسلوب ان کے اشہب قلم کی جولانی کا پتہ دیتا ہے مشہور صحافی عبداللہ ملک کے نام اس خط میں لکھتے ہیں زندگی کے شب و روز اسی طرح بسر ہوتے ہیں' اب باقی کیا رہ گیا ہے کہ اس کے لئے اضطراب ہو۔ نہ بیتے ہوئے دنوں کا افسوس ہے اور نہ حال سے کوئی شکوہ۔ مستقبل کی فکر ہی کیا' جو لوگ مستقبل کی فکر کے



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



لئے جی رہے ہیں ان سے پوچھئے ؟ اپنا تو اب چل چلاؤ ہے گور کنارے بیٹھا ہوں ۔ دیکھئے کب بلاوا آجائے ۔ اس کے سوا کوئی مشغلہ نہیں رہا کہ اپنے اللہ سے صبح شام بھیک مانگتا ہوں ۔ وہی پالنہار ہے ' وہ آخری سہارا ہے ۔ اس کے ہاں عفو و درگذر کے سوا کچھ نہیں ۔ ہمارا خدا ' ہمارا خدا ہے ۔ سزا گناہوں کی دے چکا جزا پشیمانیوں کی دے گا ۔ تمہارے لئے دن رات دعا کرتا ہوں ۔ اب چمن اور اس کی شاخیں تم نوجوانوں کی باغبانی کے سپرد ہیں ۔ جب تک جیو وضع داری سے جیو کہ یہی ایمان کی نشانی اور حاصل زندگی ہے ۔

(بحوالہ "چٹان" لاہور ۱۵ جنوری ۱۹۶۲ء)

اس خط کے انداز بیان سے جہاں شاہ جی کی تحریر کے حسن کا پتہ چلتا ہے وہاں اس آزردگی کا بھی احساس ہوتا ہے جس سے انہیں آخر عمر میں پالا پڑا "مستقبل کی فکر ہی کیا" اور "گور کنارے بیٹھا ہوں دیکھئے کب بلاوا آجائے" ایسے فقرات ہیں جن کا طویل پس منظر ہے اور یہ اقوال ان کیفیات کی غمازی کرتے ہیں جن سے شاہ جی کو گزرنا پڑا اسی طرح جب وہ اپنے جیل کے واقعات کی حسین یادوں کو آواز دیتے ہیں تو ان کی تحریر میں ایک خاص سوز انباط چھلکتا ہے جس سے پڑھنے والے کو پتہ چلتا ہے کہ لکھنے والا ان واقعات کے سنانے میں مزہ بھی محسوس کر رہا ہے ۔ مگر جب ان کی نظر اس کے مال پر پڑتی ہے تو ان کی تحریر میں ایک گونہ آزردگی عود کر آتی ہے مثلاً جیل خانہ سے متعلق اپنے مضمون "میرا عقیدہ" میں اپنے ساتھ بیتے ہوئے واقعات لکھنے کے بعد کہتے ہیں ۔

اب کہاں ' وہ بزم آرائیاں سب نقش و نگار طاق نسیاں ہوگئیں ہم میں سے کوئی رہا ہوتا تو سب بچوں کی طرح بلکتے روتے اور بادل ناخواستہ الوداع کہتے ۔ مولانا احمد سعید رہا ہونے لگے تو ان کی گھگھی بندھ گئی آنسوؤں کے تاروں سے نغمۂ جدائی پھوٹ رہا تھا ۔"

یہ تاسف زدہ لہجہ اگرچہ اس وقت کی کیفیت بیان کرتے ہوئے آیا ہے مگر درحقیقت اس میں ان کے حال دل کا وہ حصہ بھی شامل ہے جس کا ذکر گذشتہ سطور میں ہوا ۔

شاہ جی کی مہیا شدہ جملہ تحریروں پر ایک نظر ڈالنے سے ان کی تحریر کی جو خوبیاں ہمارے سامنے آتی ہیں ان میں مندرجہ ذیل بطور خاص قابل ذکر ہیں ۔

۱۔ ان کی تحریر میں بے ساختگی ہے ۔

۲۔ فقرات نہایت چست اور شستہ ہیں ۔

۳۔ اس میں قاری کو محو کر دینے کی صلاحیت ہے ۔

۴۔ انداز بیاں ایک لحاظ سے شاعرانہ ہے ۔



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



۵۔ ان کی تحریر میں ایک وسیع المطالعہ شخص کی تحریر کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

۶۔ انکسار آمیز لہجہ ہے۔

۷۔ شاعرانہ اسلوب کے ساتھ اس میں ایک جوش ہے جس سے ان کی طبیعت کا پتہ چلتا ہے ان کی تحریر کسی قومی لیڈر کی تحریر معلوم نہیں ہوتی بلکہ کسی پختہ کار مصنف اور ادیب کی تحریر معلوم ہوتی ہے کیونکہ ہمارے ہاں قومی رہنماؤں کی جو تحریریں پائی جاتی ہیں ان کا انداز بیان ایک الگ نوعیت کا ہے جس میں اپنی شخصیت کو اجاگر کرنے کا جذبہ اکثر میں پایا جاتا ہے جبکہ شاہ جی کی تحریر میں مطلقاً یہ بات نہیں پائی جاتی ان کا اسلوب جداگانہ ہے اپنے دور کے نثر نگاروں میں وہ مولانا ابوالکلام آزاد سے متاثر تھے مگر ان کی تحریر میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی جس سے یہ کہا جاسکے کہ وہ نثر میں ابوالکلام آزاد کے مقلد تھے!


آپ کے مُطالعہ کے لئے دینی، ادبی، تاریخی کتب۔

اسلام اور مرزائیت (تقابلی موازنہ): مولانا محمد عبداللہ ____ 15 روپے

قادیان سے اسرائیل تک: ابومدثرہ ____ 60 روپے

مسلمان اور قادیانی: علامہ اقبالؒ ____ 2 روپے

ابنِ عربی اور محمد قاسم نانوتوی پر مرزائی بیان: مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ 2 روپے

مرزائیت مذہبی تحریک، سیاسی بہروپ: ابومدثرہ ۔ 2 روپے

مرزا غلام احمد قادیانی: سرسید احمد خانؒ ____ 2 روپے

آئینہ مرزائیت (اہم حوالے) ____ 2 روپے

مرزائیوں کے نزدیک مسلمان کافر ہیں: (اہم حوالے) ۔ 2 روپے

بخاری اکیڈمی دارِ بنی ہاشم، مہربان کالونی ملتان۔




© rasailojaraid.com